پندرہ روزہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علیگ

• علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کے لئے ادارہ ذمہ دار ہے۔

• ہر مہینہ کی پانچ اور بیس کو شائع ہوتا ہے۔

ششماہی ایک روپیہ

فی پرچہ ۱۲ نئے پیسے

جلد ۲	۵ راگست ۱۹۵۷ء	نمبر ۲

کردار کی تربیت

علم و حکمت کے اداروں میں جہاں قوم کے دماغ ڈھالے جاتے ہیں، کردار کی تربیت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں قوم کے نوخیز دماغ اس لئے بھیجے جاتے ہیں کہ انھیں علم کے چراغوں سے روشن کیا جائے۔ ان میں احساس ذمہ داری، فرض شناسی، چھوٹوں اور بڑوں کا مرتبہ اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو سمجھنے اور انہیں اپنے کردار میں رچانے اور بسانے کا سلیقہ پیدا ہو سکے اور وہ زندگی میں اپنے اور سماج کے مفاد کے درمیان ایک مثبت تناسب قائم کر سکیں۔ ان میں اچھائیوں کو ابھارنے اور برائیوں کو مٹانے کا عذبہ جاری و ساری ہو جائے اور اس دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کا ولولہ ان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔ ان قدروں کو اپنانے سے ہی زندگی میں تہذیب نیت تمام تر رچاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اسی سے شخصیت جو اس سرزمین پر خدا کا شاہکار ہے، بنتی ہے اسی سے انسان اپنے سماج کا مفید جز بنتا ہے۔

لیکن تعلیمی اداروں میں صورت حال بالکل برعکس ہے۔ یہاں علم و حکمت کے دریا بہتے ہیں، مکاتب فکر پروان چڑھتے ہیں۔ کتب خانوں میں بیٹھ کر تنہا، ذخیال ہوتا ہے یہاں طرز رہن سہن، ظاہری آداب و اطوار اور روایتی اخلاق کے بہترین نمونے تخلیق ہوتے ہیں۔ فلسفے بگھارے جاتے ہیں لیکن زور نہیں دیا جاتا تو کردار کی تعمیر پر۔ ذہنوں میں فلسفہ کروٹیں لیتا ہے لیکن دل ویران پڑے ہیں۔ ان میں صداقت اور خلوص کی کوئی کرن نہیں پھوٹتی۔ نتیجہ کے طور پر جو نسل تیار ہو رہی ہے وہ ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے مایوس کن ہے۔

علم و فن کے ان گہواروں کے پروردہ نوجوانوں کو دیکھئے تو وہ کچھ عجیب الخلقت سے نظر آتے ہیں۔ شعائر روحانی سے انہیں کوئی شغف نہیں، ذوق صحیح سے گریزاں، ضابطہ حیات حقیقی سے منافرت کئے ہوئے، عشق کی تڑپ سے خالی، دل و دماغ حسرتوں اور نادیدہ تمناؤں کے جنازے، سماجی و معاشرتی زندگی کے مسائل سے بے نیاز، علم کو عملی جامہ پہنانے سے نا آشنا، روح کی بالیدگی انہیں نصیب ہی نہیں ہوتی، کیف و نشاط کا مفہوم یہ جانتے ہی نہیں، شمع مقصد کے لئے سلگنا جانتے ہیں نہ کسی دھن میں دنیا سب کچھ تیاگ کر سکتے ہیں۔ ان کے سینوں میں عشق کی وہ چنگاری سلگتی ہی نہیں جو شخصیت کو پارس بنا دیتی ہے اور جس کے بغیر دنیا کا کوئی بڑا کام سرزد نہیں ہو سکتا۔ ان کا مزاج بڑا ترش اور جلد باز ہے یہ ایک فیصلہ کرتے ہیں اور بہت جلد اس سے پھر جاتے ہیں۔ یہ ہر کسی کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں اور پھر ہٹ دھرمی سے اس پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر سطح بیرونی سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ یہ نہ بڑوں کو لائق احترام سمجھتے ہیں نہ چھوٹوں کو قابل محبت۔ انھیں غرض ہے تو بس اپنے آپ سے اور اپنی ذہنیت کے اس حصار میں کسی کی مداخلت گوارہ نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جب انہیں غلط باتوں سے روکا گیا ہے تو انہوں نے اپنے اساتذہ کو زد و کوب ہی نہیں، قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔ یہ ہیں ہماری نئی تعلیم کے شاہکار جنہیں ہماری یونیورسٹیاں بڑے فخر سے پیدا کر رہی ہیں!

اور ان غریبوں کی بھی کیا خطا ہے، ان کے معلموں نے انھیں یہ سکھایا ہی نہیں کہ زندگی کے لطیف جذبات اور ارفع خیالات کو اپنے دلوں میں جگہ دے سکیں اور ان کی زندگیاں تہذیب کے بھرپور رچاؤ کی جلوہ گاہ بن سکیں۔ تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ وہ یہاں وہاں سے علم کے کچھ بے ربط اور بے ضرر اصولوں کو ہمارے ذہن میں ٹھونس دے بلکہ اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ہمارے ذہنوں کو آلودگیوں میں ملوث ہونے سے بچائے اور ہمیں ان اقدار کے لئے تڑپنا سکھائے جو انسانیت کا بہترین مظہر ہیں۔ اگر تعلیم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے تو پھر ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ہمارے تعلیمی مرکزوں کے فارغ التحصیل زندگی میں کیا رول ادا کریں گے۔ اور ان کی ذات آئندہ نسل کی تیاری کے لئے برکت ثابت ہوگی یا لعنت؟ ہم سب کو جو ان اداروں کے مستقبل کے محافظ سمجھے جاتے ہیں، ان مسائل پر غور کرنا چاہئے۔

زیر لب

آفتاب ہوسٹل ہماری یونیورسٹی کا بہترین ہوسٹل تصور کیا جاتا ہے اور اس میں صرف لائق اور مستحق طلباء کو ہی جگہ ملتی ہے چونکہ اس کے کمروں میں صرف ایک ایک لڑکا رہتا ہے۔ اس لئے پڑھنے اور لکھنے کے لئے دوسرے ہوسٹلوں کے مقابلہ میں یہاں نسبتاً زیادہ خوشگوار ماحول ہونا چاہئے اور بہت سے سالوں سے اس کی یہ روایت بھی رہی ہے کہ یہ اچھے طلباء اور کھلاڑی پیدا کرتا ہے۔ یہ ہوسٹل ہمارے اولڈ بوائز کی ساعئ جمیلہ کی ایک خوبصورت یادگار ہے جس کے انتظام کی ساری ذمہ داریاں آفتاب ہال کے سپرد تھیں۔ اب سالِ گذشتہ سے اس کی ملکیت بھی آفتاب ہال کو منتقل کردی گئی ہے جب سے اس کی ملکیت بدلی ہے اس میں کئی ایک قابل تعریف تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس کا مرکزی ہال جو ڈائننگ ہال کے بطور استعمال ہوتا ہے خوبصورت فرش اور رنگ و روغن سے مزین کرایا گیا ہے۔ بالکونی کی جالیاں جو بہت شکستہ اور بوسیدہ تھیں درست ہو گئیں ہیں۔ غرض ہوسٹل کے رنگ و روپ میں خوشگوار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

لیکن ہم ناظرین کی توجہ ان دقتوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو ہوسٹل کے ساکنوں اور خصوصاً مشرقی ونگ کے ساکنوں کو پیش آتی رہتی ہیں۔ ہوسٹل کے مشرق میں بالکل قریب ہی یونیورسٹی کے محکمہ تعمیرات کا دفتر ہے۔ تعمیرات کا دفتر جہاں کہیں ہوگا وہاں بہت کچھ ہوتا ہے عمارتی ساز و سامان بھی آتا ہے۔ بالو اور ریت کی گرد بھی کمروں کی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر آتی ہے۔ عمارتی سریوں اور لوہے کی کھنکھناہٹ کی آوازیں بھی موسیقی پیدا کرتی ہے۔ مزدور اور ٹھیکہ دار بھی آتے ہیں۔ آوازیں بھی لگتی ہیں۔ نیلام اور ٹھیکہ بھی ہوتے ہیں۔ مختلف لوگ کاروں اور سائیکلوں میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ مزدور اور معمار دفتر کے سامنے پیڑوں کے نیچے اور ہوسٹل کے کمروں کے سامنے بیٹھ کر خوش گپیاں بھی کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً کمروں کے پاس پیشاب بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔

گذشتہ سال آخر میں محکمہ تعمیرات کی طرف سے یہ تحریک کی گئی کہ ہوسٹل کا مشرقی دروازہ جو دفتر کے بالکل سامنے کھلتا ہے مقفل کردیا جائے لیکن چونکہ لڑکوں کو اس سے بہت تکلیف ہوتی اس لئے انہوں نے شور مچا کر اسے کھلوا دیا۔ چھٹیوں میں جبکہ سب لڑکے گھروں کو گئے تھے اس دروازہ کو اس طرح بند کروا دیا گیا جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں اور گمان غالب یہی ہے کہ اس کے لئے زور محکمہ تعمیرات کی طرف سے پڑا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس دروازے سے دفتر والوں کو کوئی تکلیف نہیں تھی اگر کچھ تھی تو لڑکوں کو ہی کہ دفتر میں آنے والے مزدور ہوسٹل کے پاخانوں کو بھی نواز دیتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تحریک محکمہ تعمیرات کی طرف سے کیوں چلائی گئی؟ کیا محکمہ تعمیرات کا یہاں وجود ہوسٹل کے پرسکون علمی ماحول میں مخل نہیں ہو رہا ہے؟ کیا یہاں نیلام و ٹھیکوں کا شور و غل مشرقی ونگ میں رہنے والے لڑکوں کے لئے ایک مصیبت نہیں؟ اگر اس دقت سے نجات دلانے کے لئے یہ دروازہ بند کیا گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ونگ کی ساری کھڑکیاں سیمنٹ کی دیواروں سے اسی طرح بند کرادی جائیں اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس دروازہ کا بند ہونا ہوسٹل کے ساکنوں کے لئے تھوڑی بہت دشواری کا سبب ہے آسانی کا نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ کو کسی نہ کسی طرح ضرور حل کیا جائے ورنہ ہوسٹل کی علمی فضا بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔

یہ علی گڑھ ہے

جب میں علی گڑھ آیا تو میرے بال بڑھے ہوئے تھے اور میں بھی کچھ کچھ شاعر معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے سلک کی ایک بوسیدہ شیروانی پہن رکھی تھی اور اس کے بٹن گلے تک بند کرلئے تھے۔ پاجامہ بھی پوری طرح علی گڑھ کٹ تو نہیں کچھ کچھ اس سے ملتا جلتا تھا۔ غرض میں نے ہر طرح اس بات کا التزام کیا تھا کہ میں علی گڑھ کا معلوم ہوں۔ لیکن جب میں ہسٹری ہال داخلہ کی فکر میں پہنچا تو بارش ہو رہی تھی میں نے سوچا کہ ضروری کاغذات ایک تھیلے میں ڈال لوں تو محفوظ رہیں گے۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ میں جو آگے بڑھا تو ۸۰-۱۰۰ لڑکوں کا ایک گروہ میری طرف لپکا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا میں علی گڑھ آتے ہی ایسا خوبصورت ہو گیا ہوں کہ عشاق کی پوری ٹولی کی ٹولی مجھ پر واری جانے کو تیار کھڑی ہے؟ یا میں چہرے بشرہ سے کوئی علامہ، ادیب، شاعر یا سیاسی لیڈر معلوم ہو رہا ہوں جو اس طرح میری آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ اور ابھی ان ہی خیالات میں گم تھا کہ ایک آواز کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی دل تک اتر گئی "بھائی ذرا سنئے" میں رک گیا تو ایک صاحب میری طرف بڑھے اور کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کندھے سے سینے پر، سینے سے بغل میں، بغل سے کمر میں کچھ اس طرح گھومتا رہا اور میں ہاتھوں کے اس جنگل میں کچھ اس طرح گم ہوا کہ مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی اور اسی عالم میں ایک جگ بیت گیا۔ قہقہوں، تمسخر اور دھینگا مشتی کے اس جوار بھاٹے سے جب میں نکلا تو خود اپنے آپ کو پہچاننے میں تکلف ہوتا تھا اور میری ہیئت کذائی پر ساری خدائی ہنس رہی تھی اور میرے لاشعور میں اردو کے کسی مشہور شاعر کا یہ شعر "کیا کیا ہوا ہنگامہ جنوں کچھ نہیں معلوم۔ کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا" کروٹیں لے رہا تھا۔ میری شیروانی جس کے بٹن مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے آگے کی طرف لگائے تھے معلوم پیچھے کی طرف کیسے پہنچ گئے تھے، اور جنہیں میں باوجود کوشش کے ٹھیک نہیں کرسکتا تھا چونکہ شیروانی کی جیبیں اب بجائے سینے کے پشت پر ہو گئی تھیں اس لئے اندرونِ جیب کا مجھے کوئی علم نہ ہو سکا۔

غرض اس سرِ بازار رسوائی کی کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ میں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا اور اپنے ان عزیز کے یہاں جاکر دم لیا جن کے پاس داخلہ کی غرض سے ٹھہر گیا تھا۔ اس دن میں اپنے داخلہ کا کوئی حصہ مکمل نہ کرسکا۔ شیروانی گھر والوں کے قہقہوں کے درمیان کشاں کشاں کچھ اس طرح اتری کہ مجھ سے اس کی آبرو ریزی دیکھی نہ گئی۔ اور گھبراہٹ میں میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں ڈال دیئے اور بڑی دیر کے بعد یہ اعتبار آیا کہ ۳۳ نئے پیسے اور ایک پائلٹ قلم اس قیامت صغریٰ کی نذر کرآیا ہوں اور چونکہ بعد میں مجھے میرے کچھ نئے ساتھیوں نے بتایا کہ جن حضرات سے میرا سابقہ پڑا تھا وہ یہاں کے شرفاء یا بالفاظ دیگر سینیر تھے اب بھی دل نہیں چاہتا کہ میں ان شرفاء میں اور اپنے ۳۳ نئے پیسوں اور پائلٹ قلم میں کوئی تعلق یا رشتہ جوڑوں چاہے وہ محض فرضی کیوں نہ ہو! بہرحال اتنے صدمے جھیلنے کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ اپنے آپ کو علیگ برادری میں شامل سمجھوں اور ہسٹری ہال کے سامنے سینہ تان کے چل سکوں کہ اب میری شیروانی کے بٹن پیچھے کے بجائے سینہ پر



روایات کے پاسبان

اگر آپ کبھی فائنس یا کسی اور پبلک جلسہ پر سگریٹ سے شوق کر رہے ہوں اور دوست آپ کو ایک لمبا تڑنگا تندرست اکہرا جسم والا کوئی شخص گھتے تک مد فسروانی ڈھیلا پائجامہ اور جلد نے دار ترکی ٹوپی پہنے ہوئے آتا نظر آئے تو سمجھئے آپ زبردست خطرہ میں ہیں اور آن کی آن میں آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپ مختار صاحب کے سامنے کھڑے ہیں جن کی شخصیت کا رعب و دبدبہ شوکت، تمکنت اور وقار جن کے لباس کی سج دھج اور کشش آپ کے دل میں گھر کئے جانے کے باوجود خوف طاری کئے دیتی ہے ——— مختار صاحب کو پہلی بار دیکھ کر یہ ذہنیت لگتا ہوا جیسے جیسے وہ نزدیک آتے جاتے ہیں اس خوف و ہراس کے ہالہ کے بجائے ان کی شخصیت کے گرد محبت کا خاصا سا گھرا جالا بن جاتا ہے جس میں ہم بری طرح پھنس جاتے ہیں۔ اور آج ان پر قلم اٹھاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ بھی پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ارتکاب جرم کے مترادف نہ ہو!

مختار صاحب کے حسن انتظام سے کون واقف نہیں۔ انتظامی معاملات میں سوجھ بوجھ اور بگڑے ہوئے کام کو بنانے کا ہنر کوئی مختار صاحب سے سیکھے۔ ان کی پیشانی کی ایک ایک شکن بڑے سے بڑے ہنگامہ مجمعوں کو قابو میں لانے کے لئے کافی ہے۔ ان کا تدبر بڑے بڑے گمبھیر مسئلوں کو منٹوں میں سلجھا دیتا ہے۔ وہ مجلسوں اور جشنوں میں ایک تند پاسبان کی طرح دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ اور کسی معمولی سی بدنظمی کو بھی معاف نہیں کرتے۔ دوستوں اور شناساؤں کی محفلوں میں خوش گپیاں کرنے والا یار غار جب میدان میں نکلتا ہے تو اس طرح بدل جاتا ہے کہ اپنے پن کا کوئی بو باس باقی نہیں رہتی۔ یہ ضبط اور سخت گیری شاید اچھے منتظم کی کسوٹی ہے۔ مختار صاحب کو کبھی کسی نے اس سے مفر نہیں پایا۔

مختار صاحب پچھلے پچیس سال سے علی گڑھ کی تاریخ سے وابستہ رہے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز اس کی بہاروں اور جیتوں اس کے دکھوں اور امنگوں اس کی رسوائیوں اور سرخرو ئیوں میں ہر جگہ مختار صاحب ساتھ رہے ہیں اور ہر موقع پر اپنی خدمت کو بے دریغ پیش کیا ہے اس تاریخ کے پیچھے جاندار اور دلکش مجسمے مختار صاحب کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ وہ ایک مدت دراز سے اسسٹنٹ پراکٹری کر رہے ہیں۔ اور اس عہدے کے لئے اپنے آپ کو اتنا اہل ثابت کیا ہے کہ مختار صاحب اور اسسٹنٹ پراکٹری ایک چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ اپنے فرض میں اتنا ڈوب جانا کہ عمل اور عامل کا امتیاز مٹ جائے۔ وہ اپنی فرض کی معراج ہے جس سے ہم سب کو سبق لینا چاہئے!

لیکن اس وقار اور عظمت کے باوجود ان کا دل بڑا سادہ، معصوم اور ہنگیلا ہے۔ اور وہ اپنے چھوٹوں سے اس خلوص، سادگی اور پیار سے ملتے ہیں کہ ہمیں اپنی تہذیب کی اعلیٰ قدروں پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ جب تک مختار صاحب موجود ہیں ہمیں اپنے اخلاق و شرف سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کی شخصیت ہماری ثقافتی روایات کا ایک گراں بہا جزو ہے۔ وہ علی گڑھ تہذیب کے محافظ اس کی روایات کے پاسبان اور اس کی آبرو کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی عزت کرنا اور انہیں دل میں جگہ دینا ان قدروں کو سینے سے لگانا ہے جو علی گڑھ کا طرۂ امتیاز ہیں اور جنہیں ہم کسی طرح فراموش کرنے کو تیار نہیں۔

"کومی مسعود کا گیت"

بقیہ صفحہ کالم صفحہ کا یہ

منجلی وہ بنگال کی بالا
جس کے روپ انوپ کے کارن
بنگلہ دیس ہے کرشن برن
وہ تھی نیلے دیس کی سندری
اس کا جوبن ———
کالے کیس الگس اور کاجل
جامنی ہونٹ رسیلے زہن بھیگے
ڈھیلا ڈھالا بدن کی رنگت رنگ
آپ اپنی ہی سے جھلک رہی تھی
جھک وہ کیسر تن کی! ہوش اڑا دے
آنکھیں رنگ کی ایک پچکاری
جیسے ان سے آنکھ بچولی کھیلتی ہو اندھیاری
بنگلہ دیس کی سندر بالا
اس کے گلے میں کومل کلیوں کی اک مالا
انگ انگ میں جھنکار
آنکھوں میں اک انجانی بولی
کوہ میں بھری ہوئی جھنکار
ڈھلا ڈھلایا روپ
جیسے چاندی کی دھوپ
یا جیسے سنگیت "کومی مسعود کا گیت"

وہ سنسار کی پلکوں میں سوتی تھی
شبنم سے منہ کو دھوتی تھی
لہروں سے نت کھیل تھا اس کا
چڑیوں سے کچھ میل تھا اس کا
خوشبو پیتی ہنس ہنس جیتی
لیکن من میں پریم کی الجھن
پلکوں کی جھالر سے کچھ موتی برساتی
متوالی شبنم پیالی سے مدھ چھلکاتی۔
ماں کی آنکھ تھی جس کے من میں
ڈھلی ڈھلی نکھری سی آنکھیں
نیکے چتون — جن میں تھا اک زہر بجھا
چاہت، چاہ، چھل اور جادو
چنچل چنچل ایک سبھاؤ
ٹھمک ٹھمک، ٹھٹھولیاں کرتی
چال میں پربت کے بھاؤ
کھیلتی تھی کانن کانن میں
پھولوں کے کچھ سندر کھیل
کیوں کلیوں سے تھا میل
آنکھ نشیلی بات رسیلی
اس کے دل میں بندگی کا راز
بول سریلے ——— پریم الفاظ۔
دلہن چھوٹے سے جل کا بتلا انجانی جنگلوں کے
جل تھل من کو کیا سمجھے گا؟)

ذکرِ حسینؓ

(ذاکر حسین)

شہادت حسین واقعہ جسے ۱۳ صدیوں سے زیادہ بیت گئے بار بار کیوں یاد آتا ہے۔ اس کی یاد تازہ رکھنے کی کوشش ہم کیوں کرتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ تخت طلبی کی ایک ناکام کوشش تھی جس میں ہمیں ناکام فریق سے ہمدردی ہے؟ کیا یہ بس ایک مجرد والمزاج غیور سردار کی ضد تھی جس میں ضد کرنے والا اتفاق سے ہمارے محبوب اور مخدوم آقا کا جگر گوشہ تھا اس لئے ہم اس کی ترجیح کرتے ہیں؟ یا یہ بھی بے دردی اور سفاکی سے ایک کمزور جماعت کو مٹانے کی دل ہلانے والی کہانی ہے۔ جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور آنسوؤں کی چند بوندیں آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جاتی ہیں؟ دنیا کی تاریخ میں ہمدردیوں اور طرف داریوں کے ایسے واقعے ہیں اور وہ شخصی اور جماعتی ناکامیوں اور نامرادیوں بیدردیوں اور سفاکیوں کی کہانیوں سے اتنی پُر ہے کہ صرف ان کے لئے حسین کی یاد کی ایسی ضرورت نہیں۔ لیکن نہیں میں سمجھتا ہوں کہ بات اس سے گہری ہے اور انسانیت کے لئے زیادہ اہم ہے مجھے تو اس واقعہ میں انسانی ارتقاء کے اصل اصول کا راز چھپا نظر آتا ہے۔ اسے یاد کرکے ہم یاد رکھ کر انسانیت جو بھولتی بھی ہے اور بھٹکتی بھی ہے سیدھی راہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر پگڈنڈیوں پر بڑی بھرا بھی کرتی ہے۔ اور آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے بھی ہٹتی رہتی ہے، وہ انسانیت اس واقعہ کو یاد کرکے پرکھ لیتی ہے کہ اپنی صحیح راہ کو یاد رکھتی ہے چاہے یہ دھندلی سی یاد ہو جاتی ہے یہ مقصد بہت ہی کمزور سا ارادہ ہو۔ اس لئے کہ شہادت حسین کی کہانی انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے۔ شرف انسانیت کی کہانی ہے، انسان کی پستی سے بلندی کی طرف سفر کی روداد ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معیاروں کی تفسیر ہے۔ یہیں غلامی سے انسانی حریت کی طرف چلنے کی منزل ہے۔ وہ دنیا میں خدائی بادشاہت کا اعلان ہے اور انسانوں میں اس کے قیام کے امکان بلکہ لزوم پر کسی حرج سے نہ ٹوٹنے والی شہادت ہے۔ وہ منزل تکمیل انسانیت کی راہ کا چراغ ہے۔ اس چراغ کو باطل کی قوتیں جب کبھی اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتی ہیں تو حسین کی یاد اس کی لو کو اکسا دیتی ہے۔ جب راہ حق و حریت میں انسانیت کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور کیسے کچھ نہیں ڈگمگاتے تو حسین کی مثال اسے سہارا دیتی ہے اور سنبھال لیتی ہے جب دولت، قوت اور اقتدار کی فرعونیت حق پرستوں کی تہی دست اور بے وسیلہ جمعیتوں پر عرصہ زندگی تنگ کرتی ہے اور جب پیہم ناکامیوں کا ہجوم حق پر باطل ہونے کا وسوسہ دل میں ڈالتا ہے تو حسین ہی کی مثال انہیں ثبات قدم کا سبق دیتی ہے اور اس کی کفر آفرینی سے بچاتی ہے جب جماعتی زندگی کا فساد کفر کو بے حقیقت سا بنا دیتا ہے تو حسین ہی کی مثال اس فرد کو اس کی ذمہ داری یاد دلاتی ہے کہ جماعت کو اخلاقی جماعت بنانے کا فرض آخری طور پر اسی پر عاید ہوتا ہے۔ چاہے اسی کوشش میں جماعت اس کو زہر کا پیالہ پلائے، سولی پر چڑھائے یا سنگسار کرے یا سر تن سے جدا کرکے شہادت کے خون سے زمین کو لالہ زار بنائے۔ زندگی کے حریص انسانوں کو حسین یاد دلاتے ہیں کہ زندگی ہر حال میں جیئے جانے کا نام نہیں ہے۔ کبھی جان اور کبھی تسلیم جان ہے زندگی"۔ جب کامیابی کے طلائی بچھڑے کی پرستش برسوں سے ہو رہی ہے تو حسین ناکام کا نام ہی اس سحر سامری کا توڑ بن جاتا ہے۔ اور حسین کی ناکامی کے روبرو باطل کی ساری فتح مندیاں سرنگوں اور شرمسار نظر آتی ہیں۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی خاص سیاسی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے اور بہت سے دوسرے واقعات سے مربوط ہوتا ہے۔ ربط کا یہ حلقہ اکثر بہت چھوٹا ہوتا ہے اور تاریخ انسانی کی وسعت میں یہ مربوط وحدت زیادہ عرصہ تک موثر وحدت کی حیثیت نہیں رکھ سکتی اور تاریخ اسے ہوتے ہوتے بھلا دیتی ہے لیکن بعض اوقات باوجود اپنی تاریخی مکانی اور زمانی پابندیوں کے حیات انسانی کے کسی ایسے اہم اصول کی ترجمان ہوتے ہیں کہ جب تک وہ اصول کارفرما ہیں ان کا بھلانا ذہن انسانی کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ وہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہوتا سارے واقعات کی روح ہوتا ہے۔ ان واقعات کا فہم حوادث تاریخی کے بے ربط اور بےترتیب سے انبار میں ربط اور ترتیب پیدا کر دیتا ہے ان سے تاریخ کی تاریکیوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کا بظاہر بے معنی سا سلسلہ واقعات بامعنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ شہادت حسینؓ کا واقعہ اسی قسم کے واقعات میں سے ہے۔ یہ ایک مخصوص تاریخی چوکھٹے میں دراصل زندگی کے عالمگیر اصل اصول کو انسانیت کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

قدرت نے انسان کے علاوہ ہر بے جان اور جاندار مخلوق کو اپنے وجود کا توازن پانے کے لئے اندرونی کشمکش سے بچایا ہے کہیں مساوی خواص کو کہیں فطری جبلتوں کو اس توازن کا ضامن بنا دیا ہے۔ داخلی تضاد کی کٹھن منزل جو انسان کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں مقدر ہے اسی سے اور ساری مخلوق محفوظ ہے پتھر بھی اس سے مامون ہیں، جانور بھی فرشتے بھی۔ ایک انسان ہی ہے جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشمکش میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے یہ اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے پا بھی سکتا ہے ایسا لگتا ہے کہ انسان ایک درمیانی عبوری مخلوق ہے اس کے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقہ سے ملتی ہیں۔ ایک طرف الٰہی سے۔ اس کے سینہ کو متضاد قوتوں اور میلانوں کا جولانگاہ بنا کر کفر و شکر کی کشاکش میں ڈال کر روح انسانی کو یہ سعادت ارزانی کی گئی ہے کہ وہ اس شکل میں ایک ہم آہنگ و متوازن حیات طیبہ کی تعمیر کر سکتی ہے۔

اس کو واسطہ مادی اشیا کی دلفریب کشش سے بھی ہے اور مادیت سے دامن چھڑانے کا ولولہ بھی اس میں کارفرما ہے۔ یہ خود غرضی اور خود بینی کا مرکز بھی ہے۔ اور محبت کی بے غرضی اور بے نفسی سے بھی اس کا سینہ معمور ہے۔ یہ سفاکانہ تاخت و تاراج کے بے خیال اور بے خود غلط جنوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور بے لگے کٹھن سے کٹھن جماعتی تعمیر کے لئے اپنی قوت کا ایک ایک شمہ بھی وقف کر سکتا ہے۔ یہ تمرد اور نخوت و غرور کے نشہ میں معصوم گردنوں سے خون کے دریا بہانے سے نہیں جھجکتا اور تسلیم و رضا کا کشتہ بننا بھی اسی کو آتا ہے۔ یہی حریصوں کی طرح بٹورتا ہے۔ یہی بہار کی طرح لٹاتا ہے۔ یہی اوروں سے چھینتا ہے اور یہی اپنا سب کچھ اوروں پہ

نثار کر دیتا ہے۔ کبھی پلی پلی جوڑتا ہے، کبھی کچے دھاگا کاتا ہے، کبھی ہر تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیرات کے شرمندۂ احسان ہیں۔ یہ احتیاط کے مارے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے اور پھر کبھی سرفروشانہ دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے، کبھی زمین سے نگاہ نہیں ہٹا سکتا، کبھی ستاروں سے باتیں کرتا ہے، کبھی غفلت میں اعلیٰ سے منہ موڑ کر ادنیٰ کا گرویدہ ہو جاتا ہے، کبھی ہوشیار ہو کر ادنیٰ کی آلودگیوں سے دامن چھڑا کر اعلیٰ کی طرف بے تابانہ بڑھتا ہے۔ کبھی زندگی پر جان دیتا ہے اور حیات بے شرف تک پر راضی ہو جاتا ہے، کبھی جان دے کر زندگی کا چراغ روشن کر جاتا ہے اور مرگِ باشرف کو اصل حیات اور ضامنِ حیات مانتا ہے، کبھی سرکشی کرتا ہے، کبھی سرِ تسلیم خم کرتا ہے، کبھی کافر ہے، کبھی مومن، کبھی فرعون ہے، کبھی موسیٰ، کبھی شرارِ بولہبی ہے، کبھی چراغِ مصطفوی، کبھی یزید، کبھی شبیرؓ۔

اور اس کے ارتقا کا سارا راز پیہم پر اس کی فضیلت ہے، اس کی انسانیت کا سارا شرف اس میں ہے کہ یہ ادنیٰ کو اعلیٰ پر ترجیح دینے کے لئے اپنے ضمیر کی پکار اپنے قلب کے حقیقی میلان اپنی عقلِ سلیم کے پیچھے، جان توڑ کر مردِ حسنا تو ہے لیکن ان سے خالی نہیں ہو سکتا۔ برائیاں کرتا ہے، مگر اچھائی سے ہمیشہ کے لئے روگردانی نہیں کر سکتا۔ ظلم کرتا ہے مگر عدل کے مطالبے سے بے چین کرتے ہیں۔ باطل کی حمایت کرتا ہے مگر حق سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ بدنمائیوں پر قانع نظر آتا ہے، حسن کے جادو سے بے وفائی کی طرح کبھی محفوظ نہیں ہوتا۔ پستی کی گھاٹیوں میں رہتے ہوئے بھی ایک گوشۂ چشم سے اعلیٰ کی چوٹیوں کو تکتا رہتا ہے۔ جب برائیوں کا غلبہ ہوتا ہے، جماعتی زندگی مفاسد سے پُر ہوتی ہے اور ضمیر کی انفرادی زندگی اس مسموم ہوا میں دم توڑتی ہوتی ہے، اس وقت اس کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے حقیقی ضمیر کا ترجمان، اس کی اعلیٰ قدروں کا محافظ و معلم بن کر اسے جھنجھوڑتا ہے، بیدار کرتا ہے اور اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اسے اپنی حقیقی تقدیر کے فراموش کرنے یعنی روحانی خودکشی سے باز رکھتا ہے۔

کربلا میں شہادت حسینؓ کا واقعہ ارتقاءِ انسانی کے اس عمل کا ایک عظیم، بالشان غیر فانی تاریخی مظاہرہ تھا۔ یہ باطل کے مقابلہ میں افرادِ صالح کے فریضۂ انقلاب کا، حکومت کے ظلم کے مقابلہ میں شہری کے مطالبۂ عدل کا، بے دینی کے مقابلہ میں دین کا سینہ سپر ہونا تھا کہ کہیں سیاسی اقتدار و جبروت ضمیرِ انسانی کی چنگاری کو بالکل بجھا نہ دے اور کہیں مصلحت اندیشی، خوف و تن آسانی، انسانی اقدارِ مطلقہ کو بیگانہ بنا دیں۔

وہ وقت ارتقا کی ہے جس کے حامل حسینؓ اس تاریخی واقعہ میں تھے، انسان کی حیاتِ طیبہ کی ضامن ہے، یہی اسے ہمیشہ اسفل السافلین میں لوٹ جانے سے روکتی ہے، اور اس کا طریقہ کار بھی یہی ہے کہ اس کے حامل ان کے تقاضوں کو اس کی زندگی میں پورا کریں، کیونکہ اس کے تقاضے اس کے مطالبے دلیلوں سے منوائے نہیں جا سکتے، نہ خالص عقلی معقولوں سے ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں برت کر دکھانا ہوتا ہے۔ ان کی لئے آرام و آسائش کو تجنا ہوتا ہے۔ اپنے پرائے کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔ محبت کے پھول برسا کر پتھر کھانے ہوتے ہیں، دعاؤں کے جواب میں گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ مخلصانہ خدمتوں کے عوض بدگمانیاں اور بے اعتمادیاں ملتی ہیں اور ان سب کو مسکرا کر سہنا ہوتا ہے۔

مگر سب سے زیادہ وضاحت سے اور اپنی غیر مشروط مطلق شکل میں یہ وقت سامنے آتے ہیں جب ان کے لئے ناکامیوں کو کامیابیوں اور محرومیوں کو کامرانیوں پر ترجیح دی جاتی ہے، اور اپنی پوری شان اور رنگینی میں اس وقت جب ان کے لئے جان کی بازی لگانی ہوتی ہے۔ کربلا کے میدان میں اقدارِ مطلقہ کی یہ حمایت اپنی اسی صاف اور واضح اور بے میل شکل میں سب دنیا کے سامنے آئی اور ایک داستان سادہ و رنگیں سے تاریخِ انسانی کو ہمیشہ کے لئے مالا مال کر گئی۔

کس سادگی سے فرمایا اس شہیدِ انسانیت نے حق پر اپنی آخری شہادت کی ایک شب سے پہلے "لوگو! دنیا نے اپنا رنگ کیسا بدل لیا ہے، نیکی خالی ہو گئی ہے۔ افسوس دیکھتے نہیں کہ حق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور برملا علانیہ عمل کیا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑنے کو سہارا دے۔ اب وقت ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقاءِ الٰہی کی خواہش کرے۔ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔"

یہ شہیدِ حق تاج و تخت لینے نہیں نکلا تھا۔ تاج و تخت لینے والے لقا کی خواہش نہیں کیا کرتے۔ تاج و تخت چاہنے والے یکسوئی سے شہادت کا قصد کر کے نہیں نکلا کرتے۔ تاج و تخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکرِ جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہیدِ حق اس سستی کامیابی کے لئے نہیں نکلا جو انسان کو سچائی سے اکثر بے تعلق اور بیگانہ کر دیتی ہے۔ کامیابی چاہنے والے گنے چنے ساتھیوں کو معرکے سے پہلے ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے۔ وہ مقابلہ کی شب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "کل میرا اور ان کا فیصلہ ہو جائے گا، میری رائے ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ، میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہید اپنی شہادت کو انسان کے لئے اتنا صاف اور واضح بنانا چاہتا ہے کہ کسی کو سمجھنے میں ذرا دشواری نہ ہو۔ پھر جب وفادار ساتھی نہیں چھوڑتے تو قربان گاہِ تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے ان کی قربانی پیش فرماتے ہیں۔ ایک ایک کر کے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں۔ عورت اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے، جوان بیٹے کو اپنے آگے راہی ملک بقا کیا جاتا ہے، شیرخوار پیاس سے بلکتے بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا جاتا ہے، اور اپنی جان کا ہدیہ جان آفریں کے بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

اس طور پر حق کے لئے قربانی کا سبق دینے والا قربانی کی ہر دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال یک وقت پیش کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی قربانی بھی ایسی ہے جو نہ کی جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور ہے، ادھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب طاقتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان ظاہر ناکام مقتولوں کے سر کاٹے جاتے ہیں، لاشیں روندی جاتی ہیں، ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں، رسیوں سے باندھا جاتا ہے، طوق پہنائے جاتے ہیں، ناکامی کی ہر شکل کا ظہور ہوتا ہے۔

'کوی مسعود کا گیت'



میرے سامنے جب کبھی کوی گیتوں کا ذکر کرتا ہے تو میرا ذہن ہندوستانی دیہاتی زندگی کی ان رنگ رلیوں کی طرف ل ہو جاتا ہے جہاں گھنے گھنے پھولوں کے کنج میں سہیلیاں پیا ملن کی چاہ میں پہروں گنگناتی رہتی ہیں۔ جہاں سانولے ان کھیتوں اور کھلیانوں میں زندگی کی ریل پیل میں اپنی محبوبہ کی یاد میں مگن رہتے ہیں یا گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر میں سری کی لے تو گونجتی ہے۔ اور دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ساون کی گھنگھور گھٹائیں کھیتوں میں اپنے خیمے ڈال دیتی ہیں ہواؤں میں رس بھر جاتا ہے اور گاؤں کی گوری بالائیں جھولوں میں ملہاریں گاتی ہیں۔ پنگھٹ پر پنہاریں پنگھٹ کو دور دوسرے سے کبھی ٹھٹھولی اور ہنستی ہیں، اور گاؤں کی گوری برہ کی آگ میں جلتی ہے جہاں زندگی اپنے اصلی بے میل روپ میں تی ہے ۔۔۔ ان رسیلی فضاؤں میں لبوں کی ذرا سی جنبش سے سنگیت پیدا ہوتا ہے یہیں جذبات کی وہ نزاکت اور ل محسوس ہوتی ہے جو ساون میں اپنے بابل کی یاد میں بھٹکنے والی کے دل پر گزرتے ہیں۔ یہیں محبت کا ننھا سا نازک سا ترو تازگی حاصل کرتا ہے اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جڑ پکڑتا ہے۔ سنگیت اور رس کی اس دنیا میں ہر چیز انوکھی ی نظر آتی ہے۔ تن من امرت کی چڑھتی ہوئی اتھاہ ندی نظر آتا ہے ابھرتے ہوئے بدن پر رس کے ساگر کا شبہ ہوتا ہے۔ نظروں کی شعاعوں میں سواتی (نیساں) کی بوند محسوس ہے، روپ میں ایک ٹھنک ایک جھنکار، بجلی کی سی لپک، جنگ لیتی ہوئی سی ہار، پیچ و تاب کھاتی ہوئی سی صبح بل کھاتا ہوا پون رس، ایک ادھ کھلی نرگس خاربن یا تیج ساتی کا گگن ہے۔ اور رس آواز امرت کی سی پھوار لگتی ہے یا شبنم کی رسیلی جھنکار، آنکھیں رس بھرے ہوئے سروج (کنول)!

ہی مخمور فضاؤں میں گیت تخلیق پاتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ یہیں کالی داس، تلسی داس، سور داس اور میرا بائی کے گیتوں نے جنم لیا تھا۔ یہیں وہ شاعری پھلی پھولی تھی جو کے نغموں میں ہے ان میں ہمیں خالص ہندوستانی زندگی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں یہ فضا کہیں نہیں آئی۔ آئی بھی ہے تو نہیں کے برابر۔ یہاں غزل کا سکہ چلتا ہے جو ایرانی ٹکسالوں سے ڈھل کر آیا تھا۔ اردو والوں کو ہندوستانی فضا کی یہ ٹھنڈک اور گرمی یہاں کی مٹی کی خوشبو، یہاں کی ہواؤں کی لچک، یہاں کا آکاش، چاند، سورج اور سات، یہاں کے جل سے بھرے کنول کٹورے، یہاں کی کوئل کی کوک، یہ پون، رس، یہ امرت کا ساگر ایک آنکھ نہیں بھایا۔ انہیں بھایا بھی تو ایرانی گل و بلبل کا عشق، وہاں کی بہاروں کے صے، وہاں کے حسن و عشق کی کہانیاں۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ہندوستانی زندگی کا تمام تر جادو اردو میں کہیں بھی جلوہ گر نہ ہو سکا۔

کچھ تو یہ بھی تھی کہ گیتوں سے اسوا اردو والوں نے ادھر توجہ نہیں کی۔ گیت لکھنے کے لئے اس ساری فضا کو اس کی بھرپور کسک کے ساتھ جگر میں اتارنا پڑتا ہے۔ اس رسیلی زندگی نکھرتی ہوئی زندہ رگوں کو چھونا پڑتا ہے۔ اسے فن کا مرتبہ دینے سے پہلے خون میں تحلیل کرنا پڑتا ہے۔ یہ عمل روح کا بے تابانہ رقص ہے۔ اس رقص میں شاعرانہ ذہن فن و ت کے سانچوں کی بھی چنداں پرواہ نہیں کرتا۔ یہاں فکر و فلسفہ سے زیادہ لہو کی گردش کی آتشیں اور تکلف سے زیادہ خلوص اور تڑپ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان تقاضوں کو ی شاعری کے چٹخاروں میں دل لگانے والے شاعر پورا نہ کر سکے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ غزل میں اس ریاض اور معرفت کی ضرورت نہیں پڑتی ہے مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے ماحول اس گریز اور بے نیازی نے ہمارے سارے ادب کو ایک عجیب الخلقت سی شے بنا دیا ہے۔

شاعری کی مختلف اصناف میں صرف گیت ہی وہ صنف ہے جو موسیقی سے قریب ترین ہے اور بروقت جذبات کی شدت اور بے ساختگی، لطافت، نزاکت اور رچا ہوا جذب انداز ن کے حصہ میں آیا ہے کسی دوسری صنف سخن کو نصیب نہ ہو سکا۔ اردو میں اچھے گیت بہت کم کہے گئے ہیں، جنہوں نے کہے ہیں وہ ابہام سمجھے گئے ہیں۔ میرا جی کے گیتوں کو مبہم کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔ ہیں ان تہوں تک پہنچنے میں وقت لگے گا۔ شاعر نے جنہیں جھلملاتے ستاروں کی طرح تراشا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے اچھے گیت کہے ہیں لیکن پچھلی ان کی جو بھیرویں شائع ہوئی وہ اس قسم کے ادب کی کوئی اچھی مثال نہیں۔

مسعود حسین خاں ہمارے بڑے اچھے گیت نگاروں میں سے ہیں ان کے گیتوں میں ہمیں اس فضا اور اس زندگی کی جھلکیں نکھرتی ہوئی ملتی ہیں۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے میں انہیں کئی کٹھن موسموں سے گزرنا پڑا ہے۔ ابتدائی گیتوں میں ان کا یہ رنگ نظر بھی نہیں آتا۔ یہ رنگ روپ بنگال میں خوب نکھرا ہے۔ روپ بنگال ان کا شاہکار ہے۔ اس رنگ روپ نکھ سنوارنے میں انہوں نے ایڑی اور چوٹی کا زور لگا دیا ہے اور ہندوستانی پریم کی ریت کو ٹھیٹھ زبان کے ٹھاٹھ میں پیش کیا ہے۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ ل اور سرحدی افغانی کے تصورات میں جو زبردست انتر ہے اسے پریم اور ریت کے ذیل میں مسعود صاحب نے بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے لیکن گیتوں سے غزل طرف ان کا ذہنی سفر ہمارے لئے بڑا مایوس کن ہے۔ مسعود صاحب کا یہ احساس کہ "گیت میں گہرائی لانے کے لئے آریائی زبان کے ڈھائی ہزار سال کے جمالیاتی عمل میں ڈوبنا ے گا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی" ایک اعتراف شکست کی حیثیت رکھتا ہے کاش وہ یہ کڑے کوس جھیل جاتے لیکن انہوں نے یہ ریاض قبول نہیں کیا۔ اور اس طرح ہم ایک ن گیت کار سے محروم ہو گئے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ جس گہرائی کی تلاش میں غزل کی طرف منتقل ہوئے تھے کیا اسے انھوں نے پالیا ہے؟

'روپ بنگال' کے علاوہ ان کے دوسرے گیتوں میں ہماری زندگی اور پریم کی نفسیاتی الجھنوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں سماجی درد کی کچھ جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ 'وہ بات' 'غلامو کالج میں کیسے آنکھ اٹھاؤں' اور کچھ مندرجہ ذیل گیت ان کی بہترین تخلیقات ہیں جو انہیں اردو کے گیتوں کے سرمائے میں گراں بہا اضافے ہیں۔

(۱)

بھاگ گئیں جو میری خوشیاں
ساون کے بادل سے جھکیں
تاروں کی آنکھوں میں چمکیں
چاند کے ماتھے پردہ دمکیں
بھاگ گئیں جو میری خوشیاں
کلیوں کے ہونٹوں پر چھلکیں
یا ان کی آنکھوں سے چھلکیں
پلکوں پر ناچیں پھر ڈھلکیں
بھاگ گئیں جو میری خوشیاں
چنچل لہروں میں وہ لہکیں
پھولوں کے گالوں سے مہکیں
بن کر ننھی چڑیاں چہکیں
بھاگ گئیں جو میری خوشیاں

(۲)

رنگ دو نا جیون کے کچھ پل!
پریم چمن سے میں الجھن میں
امرت رس ہو کر تم برسو
اترو ایک کرن بن من میں
پھر پیشیش محل ہو جھل جھل
رنگ دو نا جیون کے کچھ پل
چنچل من تو چاہ سے پاگل
کون کرے پھر راہیں روشن
برہ کی اگنی تم ہی بھر دو
کر دو من میں چاہیں روشن
جیون میں پھر کر دو ہل چل
رنگ دو نا جیون کے کچھ پل

(روپ بنگال میں مسعود صاحب نے بنگال کی ہواؤں کا سا جادو اور اس کا سارا نیلا روپ سمو دیا ہے)

"کس جادوگر کا یہ گھر ہے

بنگلہ دیس، اک رنگ بھون
گھنے گھنے بانسوں کے جنگل
ہرے بھرے سب کھیت اور بن
کرشن برن سے بھی کچھ گہری
جس کی دھرتی اور گگن!
روپ انیلا نیلا نیلا
اور ندیوں کی روپہلی باہیں
اجلی اجلی پھیلی راہیں!
ڈالی ڈالی میں آلنگن
سوتی لتاؤں میں ہوتی کانا پھوسی سی
پھول بنوں میں یہ جھٹکی جھٹکی سی پھبن!
دیس بھی نیلا، بھیس بھی نیلا
پھولوں کی خوشبو سے بوجھل
مند ہوا کا آنچل
دھان دھنک اور ساگر جل تھل
پون کے جھونکے ہانپتے پھرتے
وہ ٹوٹا سا چاند کا درپن!
سارے دیس پر اک دھانی آنچل سا پھیلا
ایک اداسی ایک اداہٹ
ایک سپنا سا ایک نشہ سا
کھلے کھلے سارے بندھن!
سپنوں سے یہ بھری ہوائیں
اودی اودی نیلی گھٹائیں
دھان کی ہر بالی دھسری بالی سے
کان میں کچھ چپکے سے کہتی
کھیتوں کی کوروں سے لگ کر
دور پہ وہ اک ندی بہتی
دھیرے دھیرے
اک سپنا سا بہہ نکلا ہو
رودھا کی آنکھوں سے جیسے!
(پھر چلئے اس نیلے دیس کی سندری کا روپ دیکھیے)

(بقیہ صفحہ ۳۲ کالم ۳ پر)

یہ پندرہ دن

نو واردوں کا ہجوم

اس سال یونیورسٹی میں ۲۲ جولائی سے داخلے شروع ہوئے حسب معمول داخلوں میں بڑا ہجوم رہا۔ داخل شدہ طلباء کی صحیح تعداد ابھی تک ظاہر نہیں کی گئی ہے لیکن اندازہ لگایا جاتا ہے کہ سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی بہت بڑی تعداد میں داخلے ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی کے مختلف اداروں میں سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں اور ایک خوشگوار اور ہنگامہ خیز سیشن ہمارا انتظار کر رہا ہے۔

سال رواں کی کلچرل کمیٹی

کرنل بشیر حسین زیدی، وائس چانسلر نے سال رواں کے لئے مندرجہ ذیل لوگوں پر مشتمل کلچرل کمیٹی کا اعلان کیا ہے۔

ڈاکٹر نور الحسن صدر۔ ڈاکٹر نقیب الرحمٰن سکریٹری۔ اشتیاق محمد خاں جوائنٹ سکریٹری، مسز نور الحسن، ٹریژرر۔

مختلف شعبوں کے انچارج:۔

موسیقی۔ حبیب رسول۔ گروپ سنگنگ، اشتیاق محمد خاں۔ ڈرامہ۔ ڈاکٹر نقیب الرحمٰن۔ رقص، مسز محمد مجیب۔ آرٹ پینٹنگ، مسز ممتاز جہاں حیدر۔

اراکین:۔ مونس رضا، بی لے خاں۔ وحید قریشی، مس جوزف، مسز زیدی [illegible]

کچھ 'زیر لب' کے بارے میں

گذشتہ شمارے میں 'زیر لب' کے تحت ہمارا جو نوٹ نکلا تھا اسے بعض حلقوں میں غلط بے بنیاد اور جارحانہ کہا گیا ہے اور ہماری نیت پر شبہ کیا گیا ہے جہاں تک [illegible] واقعہ کا تعلق ہے وہ پہلے بھی صحیح تھا اور اب بھی صحیح ہے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس سے کسی کے شخصی جذبات کو ٹھیس لگانا یا کسی کو DEFAME کرنا مقصود تھا یہ غلط ہے۔ ہم اپنے اساتذہ کا پورا پورا احترام کرتے ہیں ہمارا مقصد ایک TREND پر تنقید کرنا تھا۔ اگر اس میں ہماری زبان یا لب و لہجہ ترش تھا تو ہمیں اس کا افسوس ہے۔

پروفیسر ہیلڈین ہندوستانی شہری بن گئے۔

برطانیہ کے ایک پروفیسر معہ اپنی بیگم کے ہندوستان کے لئے روانہ ہو چکے ہیں اور انہوں نے اپنے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے۔ ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ "میں کسی آزاد ملک میں رہنا چاہتا ہوں جہاں غیر ملکی فوجیں نہ موجود ہوں اس لئے میں نے ایسا ملک ہندوستان کو انتخاب کیا ہے۔" انہوں نے کہا جب میں برطانیہ میں غیر ملکی فوجوں کا ذکر کرتا ہوں تو میری مراد امریکنس (صرف امریکنس) سے ہے۔ کاش ہیلڈین کے اس اقدام سے پاکستانی کچھ سبق لے سکتے!

برطانوی ماہر امراض چشم علی گڑھ یونیورسٹی میں

ڈاکٹر ایف۔ سی۔ روجر، ایک برطانوی ماہر امراض چشم جو غانا میں قابل قدر خدمات انجام دے چکے ہیں، علی گڑھ آ گئے ہیں۔ وہ کولمبو پلان کے تحت علی گڑھ [illegible]

(بقیہ صفحہ ۲ کالم ۳ پر)

"ہماری جد و جہد" درجہ نہم کے طلبا کا قلمی میگزین

(تبصرہ)

"ہماری جدوجہد" کے نام سے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے درجہ نہم کے طلبا نے گزشتہ سیشن میں ایک قلمی میگزین نکالا ہے جو اُن کے ادبی ذوق اور لگن اور علمی شوق کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ یہ میگزین درجہ نہم کے کلاس ٹیچر اشتیاق محمد خاں کی نگرانی میں نکلا ہے اور سید محمد انیس اس کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ باقر علی خاں سید فصیح الدین علوی اور یوسف خاں اس کے معاونین میں سے ہیں۔ خوش نویسی کا حسن محمد اعزاز الدین کے قلم کا مرہون منت ہے۔ پرچہ کے حسن ظاہری اور باطنی دونوں کو دیکھکر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ میگزین میں بہت سی تصاویر اور فوٹوگراف بھی شامل ہیں جو کسی بیرونی مدد کے بغیر خود طلبا کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ محمد احمد علی نے فوٹوگرافی علاوہ آفاق احمد نے مختلف قسم کے آرٹ کے نمونے پیش کئے ہیں۔

شروع میں کچھ پیغامات بھی ہیں جو کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر، پروفیسر آل احمد سرور معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو (ہند) ذوقی صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول اور خود کلاس ٹیچر اشتیاق محمد خاں صاحب نے اپنے اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ ہر پیغام کے ساتھ پیغام دینے والے کی تصویر بھی شامل ہے۔ مضامین کی ترتیب و تالیف اور ان کا انتخاب بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے اور ادبی علمی اور معلوماتی سبھی قسم کے مضامین رکھے گئے ہیں۔ فوٹوگرافس کی مدد سے کلاس کے ممتاز طلبا کا تعارف سارے سال کی سرگرمیوں اور اسکول کی پچھلی زندگی کی بھرپور مصوری کی گئی ہے جو میگزین کی افادیت میں بڑا اضافہ کرتی ہے۔

اداریہ میں اس سال کی تمام اہم سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً کلاس کی تعلیمی بیت مستقل حاضری اسکول یونین اسکول میگزین کھیلیں کود اسکاؤٹنگ امیوزک اور ڈرامہ یوم تقریری آزادی، الوداعی پارٹی اور کلاس میگزین کی ترتیب و تالیف پر اچھا خاصہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس قلمی میگزین کے سلسلہ میں اداریہ کے آخری چند جملے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

"ہم بھی اس جدوجہد کو بہت کامیاب سمجھیں گے اگر اگلے سال دوسری جماعتوں کے ساتھی اپنے اپنے کلاسوں سے اسی طرح کی قلمی میگزین نکالنے لگیں۔ ہم سمجھیں گے ہماری جدوجہد کا میٹھا پھل مل گیا۔ بلکہ ہم ہی اس جدوجہد میں نہیں ہیں بلکہ ہمارے چھوٹے بڑے سب ہی شامل ہیں۔ ہم پھولوں نہ سمائیں گے اور لہک لہک کر مجروح سلطانپوری کے اس شعر کو گنگناتے پھریں گے ؎

"اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا"

اب ذرا مضامین کی بھی نوعیت دیکھئے۔ چند عنوان یہ ہیں۔ سر سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد، ٹیلیویژن، پنگ پانگ، سینما کے فوائد اور نقصانات، روپیہ کی آپ بیتی، تعلیم نسواں اور جانوروں کی عمریں وغیرہ۔

اس میگزین کی ترتیب اور اس کے اجرا میں درجہ نہم کے مشفق استاد اشتیاق محمد خاں صاحب کی ہمت افزائی اور رہنمائی قابل تعریف ہے اور وہ قابل مبارکباد ہیں کہ ان کی نگرانی میں ایک بڑا کام عمل میں آگیا۔ وہ طلبا بھی تعریف و تحسین کے مستحق ہیں جنہوں نے اس میں

بقیہ صفحہ ۲ کالم ۲ — یہ پندرہ دن

کے انسٹیٹیوٹ آف اینتھراپولوجی میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ڈاکٹر موصوف ڈیڑھ سال تک اسی عہدہ پر فائز رہیں گے۔ توقع ہے کہ علیگڑھ یونیورسٹی ڈاکٹر صاحب سے پوری طرح مستفید ہو سکے گا۔ ہم علیگڑھ کی علمی دنیا میں اس قابل قدر اضافہ پر اظہار مسرت کرتے ہیں۔

ضیاء الحسن ہاشمی ماسکو کو

معلوم ہوا ہے کہ سید ضیاء الحسن ہاشمی نیشنل یونین آف اسٹوڈینٹس کے نمائندے کی حیثیت سے عالمی یوتھ فیسٹیول میں شرکت کے لئے ماسکو روانہ ہو گئے ہیں۔

ثاقب قدوائی ایکٹنگ صدر یونین

معلوم ہوا ہے کہ ثاقب قدوائی سینئر کیبنٹ، ضیاء الحسن ہاشمی کی عدم موجودگی میں یونین کے صدر کی حیثیت سے کام کریں گے۔

وائس چانسلرز سے مولانا آزاد کا خطاب

یکم اگست کو دلی میں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کو وزیر تعلیم مولانا آزاد نے خطاب کرتے ہوئے اس افسوس کا اظہار کیا کہ یونیورسٹیوں نے تحقیقاتی کمیشن کی بہت سی سفارشات کو ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنایا ہے۔ انہوں نے کہا "ملک میں حالات بدل چکے ہیں۔ پرانا نظام تعلیم گر رہا ہے۔ اس لئے کہ یہ نئے حالات کے مطابق نہیں تھا لیکن ہم ابھی تک کسی نئے نظام تعلیم کو عملی شکل دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔" مولانا نے کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور وائس چانسلروں کے مابین ایک میٹنگ موجودہ نظام تعلیم میں ضروری اصلاحات کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

بقیہ صفحہ ۵ کالم ۲ — ذکر حسین

تاکہ حق پرستی کا سب سے موثر سبق انسانیت کے ذہن نشین ہو جائے۔ حق کا ساتھ دینا جب کامیابی ہستی و حقیقی کامیابی اسی کی جلوہ میں ہو کچھ بہت دشوار نہیں۔ اس کی راہ میں ناکامیوں کو سینہ سے لگانا، اور اس کی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ یہی انسانیت کی ضمانت ہے۔ یہی شہادت حسین کا ماحصل ہے۔ اسی سے حسین انسانیت کے محسن اعظم ہیں اور ان کی شہادت کی داستان تاریخ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی رنگین ورق!

مضامین اور نظمیں لکھیں اور اسے حسن ترتیب سے سنوارا اور نکھارا اور ایک ایسا قدم اٹھایا جو اسکول کی دوسری جماعتوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ اتنی ساری خوبیوں کے بعد میگزین میں کچھ املا کی اور زبان کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں جو آنکھوں میں کھٹکتی ہیں اور جن پر اگر ذرا سی توجہ کی جاتی تو آسانی سے دور ہو سکتی تھیں۔ بہر حال یہ کوشش ہر لحاظ سے تعریف کی مستحق ہے۔